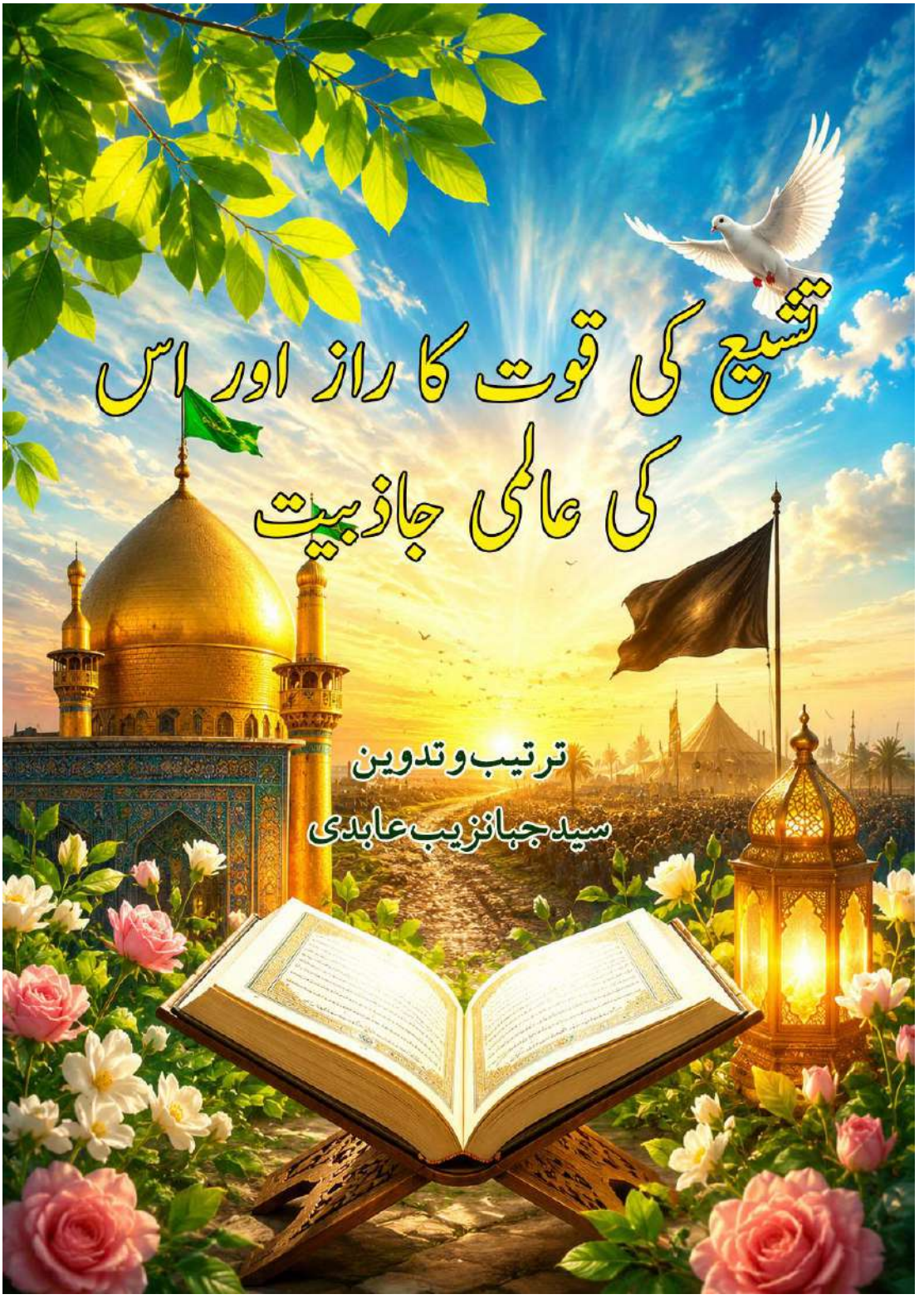
تشیع کی قوت کا راز اور اس
کی عالمی جاذبیت
ترتیب و تدوین
سید جہانزیب عابدی

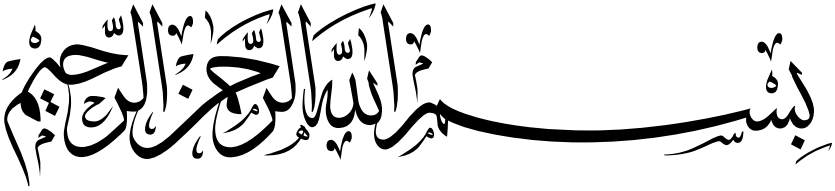

فہرست عناوین

پہلا باب: حق ہمیشہ اقلیت میں کیوں نظر آتا ہے؟ 4

دوسرا باب: تشیع کی پہلی قوت: توحید، ولایت اور انسان سازی 9

تیسرا باب: علم، عقل اور اجتہاد: تشیع کی فکری قوت کا سرچشمہ 15

چوتھا باب: شہادت کی ثقافت: وہ قوت جس نے تشیع کو ناقابلِ شکست بنا دیا 21

پانچواں باب: مظلومیت سے دعوت تک: تشیع نفرت کا نہیں، محبت، خدمت اور امید کا مکتب کیوں بن گیا؟ 29

چھٹا باب: تشیع کو مٹانے کی کوششیں کیوں ناکام رہیں؟ اس مکتب کے حفاظتی نظام کیا ہیں؟ 36

ساتواں باب: اکیسویں صدی میں تشیع کی عالمی ذمہ داری: ظہورِ امام مہدیؑ کی تیاری اور انسانیت کی رہنمائی 43

آٹھواں اور آخری باب: 50

تشیع: ایک زندہ الٰہی تحریک اور مستقبل کی ذمہ داریاں 50

پہلا باب: حق ہمیشہ اقلیت میں کیوں نظر آتا ہے؟

اگر تاریخ کو صرف جنگوں، سلطنتوں اور بادشاہوں کی تاریخ سمجھا جائے تو شاید تشیع کی بقا ایک معمہ محسوس ہو۔ لیکن اگر تاریخ کو حق اور باطل کی مسلسل کشمکش کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ معمہ خود بخود حل ہونے لگتا ہے۔ شیعہ مکتبِ فکر کی نظر میں انسانی تاریخ دراصل دو متوازی دھاراؤں کی تاریخ ہے۔ ایک وہ دھارا جو اللہ تعالیٰ کی ہدایت، انبیاء، اوصیاء اور الٰہی اقدار کا نمائندہ ہے، اور دوسرا وہ دھارا جو تکبر، خود پرستی، اقتدار پرستی اور دنیاوی مفادات کی بنیاد پر خدا کی ہدایت کے مقابل کھڑا ہوتا ہے۔

یہ کشمکش زمین پر انسان کے قدم رکھتے ہی شروع ہو گئی تھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے ابلیس نے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ بظاہر یہ ایک حکم کی نافرمانی تھی، لیکن حقیقت میں یہ اللہ کے مقرر کردہ نمائندے کی ولایت کو قبول نہ کرنے کا اعلان تھا۔ اسی لمحے سے دو راستے وجود میں آ گئے۔ ایک راستہ اطاعت، تواضع اور بندگی کا تھا، جبکہ دوسرا تکبر، خود مختاری اور بغاوت کا۔ یہی دو راستے بعد کی پوری تاریخ میں مختلف صورتوں میں سامنے آتے رہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو انکار کا سامنا کرنا پڑا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ فرعون سے ہوا،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف سازشیں ہوئیں، اور خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو بھی شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس مسلسل تاریخی تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ حق کا راستہ ہمیشہ آسان نہیں رہا۔ حق کی پہچان اکثریت، اقتدار یا ظاہری غلبے سے نہیں ہوتی بلکہ اس کے الٰہی معیار سے ہوتی ہے۔

شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی یہی کشمکش ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک نئے مرحلے میں داخل ہوگئی۔ اس مرحلے میں سوال صرف سیاسی قیادت کا نہیں تھا بلکہ اس بات کا تھا کہ دین کی حقیقی تعبیر، قرآن کی مستند تفسیر اور نبوی مشن کی حفاظت کس کے ذریعے ہوگی۔ اسی مقام پر امامت کا تصور سامنے آتا ہے، جو تشیع کی پوری فکری عمارت کی بنیاد ہے۔

یہاں ایک بنیادی سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر تشیع حق پر ہے، جیسا کہ شیعہ عقیدہ رکھتا ہے، تو پھر اسے مسلسل مخالفت، ظلم، قتل و غارت، پروپیگنڈے اور پابندیوں کا سامنا کیوں کرنا پڑا؟

اس سوال کا جواب خود قرآن مجید میں موجود ہے۔ قرآن ہمیں بار بار یہ بتاتا ہے کہ انبیاء کی اکثریت کو اپنی قوموں کی مخالفت برداشت کرنا پڑی۔ حضرت

نوح علیہ السلام پر لوگ ہنستے رہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالنے کا فیصلہ کیا گیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے فرعون جیسی سپر پاور کھڑی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ میں تیرہ سال تک شدید اذیتیں برداشت کرنا پڑیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کسی دعوت کے باطل ہونے کی دلیل نہیں بلکہ بعض اوقات اس کے حق ہونے کا لازمی نتیجہ بھی بن جاتی ہے، کیونکہ حق ہمیشہ ان مفادات کو چیلنج کرتا ہے جن پر ظلم کا نظام قائم ہوتا ہے۔

تشیع کی تاریخ اسی قرآنی اصول کا ایک تسلسل دکھائی دیتی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام سے لے کر امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام اور دیگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام تک مسلسل سیاسی دباؤ، قید، نگرانی، جلاوطنی، زہر اور شہادت کا سلسلہ جاری رہا۔ شیعہ عقیدے کے مطابق بارہویں امام حضرت امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف بھی ایسے حالات میں غیبت میں گئے جب ان کی جان کو شدید خطرات لاحق تھے اور ظالم حکومتیں انہیں شہید کر دینا چاہتی تھیں۔ اس طرح شیعہ تاریخ کا ہر باب آزمائش، صبر اور استقامت سے عبارت ہے۔

لیکن یہاں اصل سوال یہ نہیں کہ تشیع پر ظلم کیوں ہوا، بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ اتنے طویل ظلم کے باوجود تشیع ختم کیوں نہ ہو سکا؟

دنیا کی بے شمار تحریکیں چند دہائیوں میں ختم ہو گئیں۔ بہت سی سلطنتیں تاریخ کے صفحات میں دفن ہو گئیں۔ طاقتور حکومتیں ٹوٹ گئیں۔ عظیم فوجیں مٹ گئیں۔ لیکن تشیع، جو صدیوں تک اکثر سیاسی اقتدار سے محروم رہا، آج بھی دنیا کے مختلف براعظموں میں زندہ، متحرک اور فکری طور پر فعال ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔

کسی بھی نظریے کی بقا کے لیے تین بنیادی چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔ پہلی، اس کے پاس ایک مضبوط فکری بنیاد ہو۔ دوسری، اس کے پاس ایسا اخلاقی سرمایہ ہو جو اس کے پیروکاروں کو قربانی پر آمادہ رکھے۔ تیسری، اس کے پاس ایسا روحانی سرچشمہ ہو جو مایوسی کے زمانوں میں بھی امید پیدا کرتا رہے۔ اگر ان تینوں میں سے ایک چیز بھی کمزور ہو تو تحریک زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی۔ تشیع کے اندر یہ تینوں عناصر ایک ساتھ موجود ہیں، اور یہی اس کی غیر معمولی پائیداری کا بنیادی راز ہیں۔

یہاں ایک اور حقیقت بھی قابلِ غور ہے۔ تشیع نے اپنی تاریخ کا بڑا حصہ دفاعی حالت میں گزارا ہے، مگر اس کے باوجود اس نے صرف اپنے وجود کو

محفوظ نہیں رکھا بلکہ علم، فقہ، فلسفہ، تفسیر، حدیث، عرفان، ادب، فنِ تعمیر، شاعری اور سماجی خدمت جیسے میدانوں میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی قوت صرف جذباتی وابستگی میں نہیں بلکہ ایک مکمل تہذیبی اور فکری نظام میں پوشیدہ ہے۔

اسی لیے آج جب دنیا کے مختلف حصوں میں لوگ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں سے بعض کو یہاں ایسا فکری تسلسل، اخلاقی استحکام اور روحانی گہرائی نظر آتی ہے جو انہیں مزید تحقیق پر آمادہ کرتی ہے۔ البتہ یہ بھی حقیقت ہے کہ افراد کے تشیع سے متاثر ہونے کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں، اور ان سب کو ایک ہی وجہ سے تعبیر کرنا درست نہیں ہو گا۔

دوسرا باب: تشیع کی پہلی قوت: توحید، ولایت اور انسان سازی

پہلے باب میں ہم نے یہ دیکھا کہ شیعہ نقطۂ نظر کے مطابق تاریخ دراصل حق اور باطل کی مسلسل کشمکش کا نام ہے، اور تشیع اسی تاریخی تسلسل کا ایک زندہ مظہر ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر وہ کون سا بنیادی عنصر ہے جس نے تشیع کو ہر دور کی آزمائشوں میں زندہ رکھا؟ کیا اس کی قوت صرف مظلومیت کے احساس میں پوشیدہ ہے؟ کیا صرف کربلا کی یاد اسے زندہ رکھتی ہے؟ یا اس کے پس منظر میں کوئی ایسا ہمہ گیر فکری نظام موجود ہے جو ہر نسل میں نئی زندگی پیدا کرتا ہے؟

اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے تشیع کی بنیاد تک جانا ہوگا۔ شیعہ مکتب کی پہلی اور سب سے بڑی طاقت اس کی توحیدی فکر ہے۔ عام طور پر توحید کو صرف اس عقیدے تک محدود کر دیا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔ یہ یقیناً توحید کا بنیادی تقاضا ہے، لیکن قرآن مجید میں توحید کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ قرآن انسان کو صرف یہ نہیں سکھاتا کہ اللہ ایک ہے، بلکہ یہ بھی سکھاتا ہے کہ اقتدار حقیقی صرف اسی کا ہے،

قانون سازی کا اصل حق اسی کو حاصل ہے، حاکمیت اسی کی ہے، رزق اسی کے ہاتھ میں ہے، عزت اور ذلت اسی کے اختیار میں ہیں اور بندگی بھی صرف اسی کے لیے ہے۔

جب انسان اس توحیدی شعور کو اپنی پوری زندگی پر نافذ کرتا ہے تو پھر وہ کسی ظالم طاقت، کسی سامراج، کسی بادشاہ، کسی سرمایہ دار یا کسی اکثریت کو مطلق اختیار کا مالک نہیں سمجھتا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ فکر میں توحید صرف مسجد کی عبادت نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے کی بنیاد بن جاتی ہے۔

یہی توحیدی فکر آگے چل کر ولایت کے تصور کو جنم دیتی ہے۔ اگر حقیقی حاکم صرف اللہ ہے تو پھر انسانوں میں وہی قیادت جائز ہو گی جسے اللہ منتخب کرے یا جس کے انتخاب کی بنیاد اللہ کی ہدایت ہو۔ شیعہ عقیدے کے مطابق امامت اسی الٰہی نظام کا تسلسل ہے۔ اس لیے ولایت کا تعلق کسی خاندان پرستی یا نسلی امتیاز سے نہیں بلکہ الٰہی منصوبۂ ہدایت سے ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ سمجھنا ضروری ہے۔ دنیا کی اکثر سیاسی تحریکیں اقتدار کے حصول سے شروع ہوتی ہیں، لیکن تشیع کی ابتدا اقتدار سے نہیں بلکہ ہدایت سے ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اصل سوال یہ نہیں کہ حکومت کس کے ہاتھ میں ہے بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ انسان کو اللہ کی طرف صحیح راستہ کون

دکھائے گا۔ اگر رہنما خود گمراہ ہو تو اقتدار خواہ کتنا ہی وسیع کیوں نہ ہو، وہ انسانیت کو منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔

اسی لیے شیعہ فکر میں امام صرف ایک حکمران نہیں بلکہ معلم، مربی، مفسرِ قرآن، عادل رہنما اور انسان ساز ہوتا ہے۔ وہ صرف قوانین نافذ نہیں کرتا بلکہ انسانوں کے باطن کی تعمیر بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی زندگیوں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی توانائیاں صرف سیاسی جدوجہد پر صرف نہیں کیں بلکہ علم، اخلاق، عبادت، تربیت، عدل، سماجی اصلاح اور انسانی کردار سازی پر بھی بھرپور توجہ دی۔

یہی انسان سازی تشیع کی اصل طاقت ہے۔

دنیا میں بہت سی تحریکیں اپنے مخالفین کو شکست دے کر کامیاب ہوتی ہیں، لیکن وہ اپنے کارکنوں کی شخصیت نہیں بنا پاتیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اقتدار ملنے کے بعد انہی کے اندر ظلم، کرپشن، مفاد پرستی اور اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس تشیع نے ابتدا ہی سے انسان کی اندرونی اصلاح کو بیرونی تبدیلی پر مقدم رکھا۔

حضرت علی علیہ السلام کا پورا طرزِ زندگی اس حقیقت کی روشن مثال ہے۔ آپ کے نزدیک حکومت کا مقصد اقتدار کا لطف اٹھانا نہیں بلکہ عدل قائم کرنا تھا۔

آپ نے فرمایا کہ اگر حکومت انصاف قائم نہ کر سکے تو میرے نزدیک پھٹی ہوئی جوتی بھی اس سے زیادہ قیمتی نہیں۔ یہ سوچ کسی عام سیاسی فلسفے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ گہری توحیدی معرفت سے جنم لیتی ہے۔

اسی طرح امام حسن علیہ السلام کی صلح بھی دراصل انسانوں کو بچانے کی حکمت تھی، جبکہ امام حسین علیہ السلام کا قیام انسانی ضمیر کو زندہ کرنے کی جدوجہد تھا۔ دونوں کے راستے مختلف دکھائی دیتے ہیں، لیکن دونوں کا مقصد ایک ہی تھا: دین کی حفاظت اور انسان کی اصلاح۔

یہی وجہ ہے کہ تشیع میں ہر امام نے اپنے زمانے کے مطابق مختلف حکمتِ عملی اختیار کی، مگر مقصد کبھی تبدیل نہیں ہوا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشیع کسی جامد سیاسی پروگرام کا نام نہیں بلکہ ایک زندہ الٰہی مکتب ہے جو اصولوں میں ثابت قدم اور طریقۂ کار میں حکیمانہ لچک رکھتا ہے۔

اسی انسان سازی کے نتیجے میں تشیع نے ایسے افراد پیدا کیے جو بظاہر کمزور تھے لیکن اخلاقی اعتبار سے ناقابلِ شکست تھے۔ حجر بن عدی، میثم تمار، رشید ہجری، مسلم بن عقیل، حبیب بن مظاہر اور کربلا کے دیگر اصحاب کی زندگیاں اس حقیقت کی گواہ ہیں کہ جب انسان کی شخصیت توحید اور ولایت کی بنیاد پر تعمیر

ہو جائے تو پھر خوف، لالچ، دھمکی اور دنیاوی مفادات اسے اپنے اصولوں سے ہٹا نہیں سکتے۔

یہاں ایک بنیادی فرق بھی سامنے آتا ہے۔ دنیا کے بہت سے نظریات اپنے کارکنوں کو کسی جماعت یا قوم کے لیے قربانی دینا سکھاتے ہیں، جبکہ تشیع انسان کو سب سے پہلے اللہ کے لیے جینا اور اللہ کے لیے مرنا سکھاتا ہے۔ جب قربانی کا مرکز اللہ ہو جائے تو پھر قوم، وطن، خاندان اور سیاست بھی اپنی صحیح جگہ پر آجاتے ہیں اور انسان شخصیت پرستی کا شکار نہیں ہوتا۔

شاید یہی وجہ ہے کہ تشیع میں شخصیات کی عظمت بھی ان کی بندگیِ خدا کی وجہ سے ہے، نہ کہ ان کی سیاسی کامیابیوں کی وجہ سے۔ حضرت فاطمہ زہراؑ، حضرت علیؑ، امام حسنؑ، امام حسینؑ اور دیگر ائمہ اہل بیتؑ کی عظمت کا سرچشمہ ان کی عبودیت، تقویٰ، علم اور قربِ الٰہی ہے۔ یہی معیار تشیع کو شخصیت پرستی سے نکال کر خدا پرستی کی طرف لے جاتا ہے۔

اسی بنیاد پر شیعہ مکتب اپنے ماننے والوں کو مسلسل خود احتسابی کی دعوت دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف اہل بیتؑ سے محبت کا دعویٰ کرے لیکن اس کے کردار میں عدل، امانت، تقویٰ، دیانت، خدمت اور اخلاق نہ ہوں تو اہل بیتؑ

کی تعلیمات کے مطابق وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا۔ اس لیے تشیع میں محبت اور اطاعت کو عمل سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وہ نکتہ ہے جو تشیع کو محض ایک تاریخی شناخت یا ثقافتی روایت بننے سے روکتا ہے۔ اس کی اصل روح انسان کی مسلسل تربیت، تزکیۂ نفس اور اللہ سے تعلق کو مضبوط کرنا ہے۔ جب تک یہ روح زندہ رہے گی، تشیع بھی زندہ رہے گا، خواہ اس کے ماننے والے سیاسی اقتدار میں ہوں یا نہ ہوں۔

اسی انسان ساز فکر نے تشیع کو ایک ایسا اخلاقی سرمایہ عطا کیا ہے جو صرف اس کے ماننے والوں تک محدود نہیں رہا بلکہ دنیا کے بہت سے انصاف پسند اور حق پسند افراد کو بھی متاثر کرتا رہا ہے۔ جب کوئی غیر مسلم یا غیر شیعہ اہل بیتؑ کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ اکثر ان شخصیات میں اقتدار کی خواہش نہیں بلکہ انسانیت کی خدمت، اصولوں پر استقامت اور خدا کی بندگی کا ایسا نمونہ دیکھتا ہے جو ہر زمانے کے انسان کے لیے قابلِ احترام ہے۔

تیسرا باب: علم، عقل اور اجتہاد: تشیع کی فکری قوت کا سرچشمہ

تشیع کی پائیداری کا ایک بہت بڑا راز اس کا علمی مزاج ہے۔ اگر کوئی شخص شیعہ تاریخ کا غیر جانبداری سے مطالعہ کرے تو اسے معلوم ہو گا کہ تشیع نے اپنے وجود کی حفاظت صرف جذبات، نعروں یا تاریخی یادداشت کے ذریعے نہیں کی بلکہ علم، تحقیق، استدلال اور مسلسل فکری ارتقاء کے ذریعے بھی کی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس نے اسے محض ایک مذہبی گروہ بننے سے بچایا اور ایک زندہ علمی مکتبِ فکر کی حیثیت عطا کی۔

قرآن مجید کی پہلی وحی ہی "اقرأ" سے شروع ہوتی ہے۔ یہ محض پڑھنے کا حکم نہیں بلکہ ایک تہذیب کی بنیاد ہے۔ قرآن بار بار انسان کو غور و فکر، تدبر، تعقل، تفقہ اور بصیرت کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن میں "کیا تم عقل نہیں رکھتے؟"، "کیا تم غور نہیں کرتے؟"، "کیا تم سمجھتے نہیں؟" جیسے سوالات بار بار آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اندھی تقلید کا مذہب نہیں بلکہ شعوری ایمان کا دین ہے۔

شیعہ مکتب نے اسی قرآنی دعوت کو اپنے فکری نظام کا بنیادی ستون بنایا۔ اہل بیت علیہم السلام کی روایات میں عقل کو غیر معمولی مقام حاصل ہے۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے منقول ہے کہ اللہ نے انسانوں پر دو حجتیں قائم کی ہیں: ایک ظاہری حجت، یعنی انبیاء اور ائمہ، اور دوسری باطنی حجت، یعنی عقل۔ اس روایت کا مطلب یہ نہیں کہ عقل وحی سے بے نیاز ہے، بلکہ یہ کہ صحیح عقل اور صحیح وحی ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، نہ کہ ایک دوسرے کی نفی۔

یہی وہ نکتہ ہے جس نے تشیع کو فکری جمود سے محفوظ رکھا۔ اگر عقل کو بالکل معطل کر دیا جائے تو دین محض رسوم کا مجموعہ بن جاتا ہے، اور اگر وحی کو نظر انداز کر دیا جائے تو عقل خواہشات کی غلام بن سکتی ہے۔ اہل بیتؑ نے ان دونوں انتہاؤں سے بچاتے ہوئے عقل اور وحی کے درمیان ایک متوازن تعلق قائم کیا۔

اسی توازن کا عملی اظہار امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں نمایاں نظر آتا ہے۔ اس زمانے میں اسلامی دنیا میں مختلف فکری تحریکیں جنم لے رہی تھیں۔ فلسفہ، منطق، طبیعیات، طب، فلکیات اور مختلف مذاہب کے افکار اسلامی معاشرے میں داخل ہو رہے تھے۔ ایسے ماحول میں

اہل بیتؑ نے اپنے شاگردوں کو صرف فقہی مسائل نہیں سکھائے بلکہ استدلال کا طریقہ، مکالمے کا ادب اور علمی دیانت بھی سکھائی۔

امام جعفر صادق علیہ السلام کی درسگاہ میں مختلف مکاتبِ فکر کے لوگ آتے تھے۔ بعض سوال کرنے آتے، بعض مناظرہ کرنے اور بعض اعتراض کرنے۔ لیکن امامؑ نے ان سب کے ساتھ دلیل، حکمت اور اخلاق کے ساتھ گفتگو کی۔ یہ طرزِ عمل اس بات کی علامت تھا کہ حق کو دلیل سے خوف نہیں ہوتا۔ جو فکر مضبوط بنیادوں پر کھڑی ہو، وہ سوالات سے نہیں گھبراتی بلکہ انہیں اپنے تعارف کا ذریعہ بناتی ہے۔

یہی علمی اعتماد تشیع کی ایک بڑی طاقت ہے۔

اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ جب بھی تشیع پر سیاسی پابندیاں لگیں، اس نے مدارس قائم کیے۔ جب مساجد محدود کی گئیں تو اس نے علمی حلقے قائم کیے۔ جب حکومتوں نے قلم روکنے کی کوشش کی تو علماء نے کتابیں لکھیں۔ جب تبلیغ پر پابندیاں لگیں تو شاگرد تیار کیے۔ گویا اس نے ہر بحران کو علم کے ذریعے موقع میں تبدیل کیا۔

یہی وجہ ہے کہ شیعہ تاریخ میں ہزاروں علمی کتابیں لکھی گئیں۔ تفسیر، حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، فلسفہ، کلام، رجال، تاریخ، اخلاق، عرفان اور دیگر

علوم میں مسلسل تحقیق ہوتی رہی۔ اس علمی سرمائے نے تشیع کو صرف محفوظ ہی نہیں رکھا بلکہ ہر دور میں نئے سوالات کے جواب دینے کے قابل بھی بنایا۔ یہاں اجتہاد کی اہمیت سامنے آتی ہے۔

اجتہاد کا مطلب دین میں نئی باتیں ایجاد کرنا نہیں، بلکہ قرآن، سنت، عقل اور معتبر دلائل کی روشنی میں نئے پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ ہر زمانے میں ایسے مسائل پیدا ہوتے ہیں جن کا لفظی ذکر قدیم کتابوں میں نہیں ہوتا۔ مثلاً جدید طب، مصنوعی ذہانت، جینیاتی تحقیق، ڈیجیٹل معیشت، بین الاقوامی قوانین، خلائی سفر اور بائیو ٹیکنالوجی جیسے موضوعات۔ اگر دین کے پاس ان کے بارے میں سوچنے کا کوئی اصولی نظام نہ ہو تو وہ عملی زندگی سے کٹ جائے گا۔

شیعہ فقہ میں اجتہاد کا نظام اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ہر دور میں اہلِ علم بنیادی اسلامی اصولوں کی روشنی میں نئے مسائل پر غور کرتے ہیں۔ اس سے دین اپنی اصل پر قائم رہتے ہوئے زمانے کے تقاضوں کا جواب دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ اجتہاد کا مطلب ہر شخص کی ذاتی رائے نہیں ہے۔ جس طرح طب میں ہر شخص ڈاکٹر نہیں بن سکتا اور قانون میں ہر شخص

جج نہیں بن سکتا، اسی طرح دینی اجتہاد بھی برسوں کی گہری علمی محنت، زبان، قرآن، حدیث، اصولِ فقہ، رجال اور دیگر علوم میں مہارت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لیے اجتہاد نظم، تحقیق اور علمی ذمہ داری کا نام ہے، نہ کہ بے قاعدہ رائے زنی کا۔

تشیع کی فکری قوت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اس نے علم کو عبادت قرار دیا۔ اہل بیتؑ کی تعلیمات میں عالم کی فضیلت، علم حاصل کرنے کی ترغیب اور جہالت سے نجات پر بہت زور دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ معاشروں میں مدارس، لائبریریاں، تحقیقی مراکز اور علمی نشستیں ہمیشہ اہمیت رکھتی رہی ہیں۔

اس علمی روایت نے صرف دینی علوم ہی کو فروغ نہیں دیا بلکہ بہت سے شیعہ علماء نے فلسفہ، ریاضیات، فلکیات، طب، ادب اور دیگر میدانوں میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تشیع علم کو صرف مذہبی دائرے تک محدود نہیں کرتا بلکہ اسے انسانیت کی خدمت کا ذریعہ سمجھتا ہے، بشرطیکہ وہ علم عدل، اخلاق اور خدا شناسی سے جدا نہ ہو۔

یہی وہ نکتہ ہے جو آج کے دور میں بھی بہت سے تعلیم یافتہ افراد کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ تشیع سوال پوچھنے، تحقیق کرنے، دلائل

کا جائزہ لینے اور مختلف آراء کا مطالعہ کرنے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو ان کے لیے یہ ایک ایسا مکتب بن جاتا ہے جس میں ایمان اور عقل ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معاون دکھائی دیتے ہیں۔

البتہ یہاں ایک اہم حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ صرف علمی قوت کسی تحریک کو ہمیشہ زندہ نہیں رکھ سکتی۔ دنیا میں بہت سے فلسفیانہ مکاتب وجود میں آئے، عظیم کتابیں لکھی گئیں، لیکن وہ عوامی زندگی سے کٹ گئے کیونکہ ان کے پاس ایسا اخلاقی نمونہ نہیں تھا جو علم کو کردار میں تبدیل کر سکے۔

تشیع کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں علم کا مقصد صرف معلومات میں اضافہ نہیں بلکہ انسان کی اصلاح ہے۔ اگر علم انسان کو متکبر، خود پسند اور بے عمل بنا دے تو اہل بیتؑ کی تعلیمات کے مطابق وہ حقیقی علم نہیں۔ حقیقی علم وہ ہے جو انسان کو خدا کے قریب، بندگانِ خدا کے لیے مفید، انصاف کا علمبردار اور اخلاق کا نمونہ بنا دے۔

اسی لیے اہل بیتؑ کی درسگاہ میں عالم ہونے سے پہلے انسان بننا سکھایا جاتا ہے، اور یہی وہ چیز ہے جو تشیع کے علمی نظام کو محض ایک تعلیمی ادارہ نہیں بلکہ ایک تربیتی مکتب بنا دیتی ہے۔

چوتھا باب: شہادت کی ثقافت: وہ قوت جس نے تشیع کو ناقابلِ شکست بنا دیا

اگر تشیع کی علمی روایت اس کا دماغ ہے، اگر توحید اور ولایت اس کا قلب ہیں، تو شہادت کی ثقافت اس کی روح ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس نے تشیع کو ہر دور میں زندہ رکھا، اسے شکست خوردہ ہونے سے بچایا اور اس کے ماننے والوں کو یہ یقین عطا کیا کہ حق کی کامیابی صرف اقتدار حاصل کرنے کا نام نہیں بلکہ اللہ کے لیے حق پر ثابت قدم رہنا بھی کامیابی ہے۔

دنیا کی اکثر سیاسی اور فکری تحریکیں اپنے رہنماؤں کی زندگی پر قائم رہتی ہیں۔ جب رہنما قتل ہو جائیں، جیلوں میں ڈال دیے جائیں یا اقتدار سے محروم ہو جائیں تو تحریکیں بکھرنے لگتی ہیں۔ لیکن تشیع کی تاریخ اس اصول کے برعکس نظر آتی ہے۔ یہاں ہر شہادت نے تحریک کو کمزور کرنے کے بجائے مزید مضبوط کیا۔ ہر خون نے ایک نئی بیداری پیدا کی، ہر قربانی نے ایک نئی نسل کو جنم دیا اور ہر ظلم نے حق کے پیغام کو مزید واضح کر دیا۔

یہ محض ایک تاریخی اتفاق نہیں بلکہ ایک گہری فکری اور قرآنی حقیقت ہے۔ قرآن مجید شہداء کے بارے میں اعلان کرتا ہے کہ انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ

اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور رزق دیے جاتے ہیں۔ اس آیت نے شہادت کو شکست کی علامت نہیں بلکہ حیاتِ جاوداں کی علامت بنا دیا۔ یہی تصور اہل بیت علیہم السلام کی پوری سیرت میں عملی صورت اختیار کرتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی کو اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ آپ کی دعوت کا آغاز ہی قربانی سے ہوا۔ مکہ کے تیرہ برس مسلسل اذیتوں، معاشرتی بائیکاٹ، طعن و تشنیع، قتل کی سازشوں اور ہجرت کے امتحان سے عبارت ہیں۔ پھر مدینہ میں بدر، احد، خندق، خیبر، حنین اور دیگر معرکوں میں آپ نے اپنی جان کو بارہا خطرات میں ڈالا۔ شیعہ اور متعدد سنی روایات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کو طبعی وفات کے بجائے زہر کے اثرات سے متعلق بھی بیان کیا گیا ہے، اور شیعہ عقیدے میں آپ کو شہید مانا جاتا ہے۔ اس طرح اسلام کے بانی ہی نے اپنی پوری حیات سے یہ تعلیم دی کہ حق کا راستہ آرام کا راستہ نہیں بلکہ قربانی کا راستہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کی مختصر مگر دردناک زندگی بھی اسی تسلسل کا حصہ ہے۔ اپنے والد کی رحلت کے بعد آپ نے جن مصائب، جسمانی اذیتوں اور سیاسی دباؤ کا سامنا کیا، وہ شیعہ تاریخ میں صرف ایک خاندانی سانحہ نہیں بلکہ ولایت کے دفاع کی پہلی عظیم

قربانی سمجھے جاتے ہیں۔ شیعہ عقیدے کے مطابق آپ کی شہادت نے یہ واضح کر دیا کہ حق کی حفاظت کے لیے خواتین بھی تاریخ کا رخ بدلنے والی قربانیاں پیش کر سکتی ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام کی پوری زندگی بھی قربانی کا استعارہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر پر سونا، مسلسل جنگوں میں اسلام کا دفاع کرنا، پھر تقریباً پچیس برس تک امت کے وسیع تر مفاد میں صبر کرنا، اور آخرکار محرابِ عبادت میں ضربت کھا کر شہید ہونا، یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ ولایت کا راستہ اقتدار کی طلب نہیں بلکہ اللہ کی رضا کا راستہ ہے۔

امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی شہادت بھی ایک منفرد پیغام رکھتی ہے۔ بعض لوگوں نے صلح کو کمزوری سمجھا، لیکن تاریخ نے ثابت کیا کہ وہ دراصل امت کو ایک بڑے داخلی قتلِ عام سے بچانے کی حکمت تھی۔ بعد میں زہر دے کر آپ کو شہید کر دیا گیا۔ اس شہادت نے یہ حقیقت آشکار کی کہ ظالم طاقتیں صرف میدانِ جنگ میں ہی نہیں بلکہ سازش، دھوکے اور خفیہ منصوبہ بندی کے ذریعے بھی حق کے نمائندوں کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

پھر تاریخ کربلا آتی ہے، جو صرف تشیع ہی نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ کا ایک عظیم اخلاقی موڑ ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے صرف ایک حکومت کے خلاف قیام نہیں کیا تھا۔ آپ نے ایک ایسے نظام کو چیلنج کیا تھا جو دین کے نام پر ظلم کو جائز قرار دینا چاہتا تھا۔ اگر امام حسین علیہ السلام یزید کی بیعت کر لیتے تو شاید وقتی طور پر خونریزی رک جاتی، لیکن دین کی اخلاقی بنیادیں منہدم ہو جاتیں۔ اس لیے آپ نے اپنی جان، اپنے اہلِ خانہ، اپنے جوان بیٹوں، اپنے شیر خوار بچے اور اپنے جانثار ساتھیوں کو قربان کر کے یہ اعلان کیا کہ اسلام صرف ظاہری بقا کا نام نہیں بلکہ اصولوں کی حفاظت کا نام ہے۔

کربلا کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں تعداد، اسلحہ اور ظاہری طاقت فیصلہ کن عنصر نہیں تھے۔ فیصلہ کن چیز حق پر استقامت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یزید بظاہر جنگ جیت گیا، مگر تاریخ کے اخلاقی فیصلے میں ہمیشہ کے لیے ہار گیا، جبکہ امام حسین علیہ السلام ظاہری طور پر شہید ہوئے لیکن ہمیشہ کے لیے ضمیرِ انسانیت کے امام بن گئے۔

اگر کربلا صرف ایک تاریخی واقعہ ہوتی تو شاید اس کا اثر چند سالوں یا چند صدیوں تک محدود رہتا، لیکن کربلا ایک مستقل شعور بن گئی۔ عاشورا ہر سال

انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ ظلم کبھی اتنا طاقتور نہیں ہوتا کہ حق کو ہمیشہ کے لیے مٹا سکے، اور حق کبھی اتنا کمزور نہیں ہوتا کہ ظلم کے سامنے سر جھکا دے۔

امام زین العابدین علیہ السلام نے اسی شہادت کی ثقافت کو دعا، عبادت اور اخلاق کے ذریعے زندہ رکھا۔ اگر آپ صرف ماتمِ شہداء کرتے اور معاشرے کی فکری تعمیر نہ کرتے تو شاید کربلا ایک جذباتی یاد بن کر رہ جاتی۔ لیکن آپ نے صحیفۂ سجادیہ اور اپنی تربیت کے ذریعے شہادت کے پیغام کو روحانی اور اخلاقی تحریک میں تبدیل کر دیا۔

امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے کربلا کے خون کو علم کی روشنی میں بدل دیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ اگر شہادت کے بعد علمی تعمیر نہ ہو تو قربانی کا پیغام آنے والی نسلوں تک صحیح صورت میں منتقل نہیں ہو سکتا۔

امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے طویل قید و بند برداشت کی اور آخر کار زہر دے کر شہید کیے گئے۔ آپ نے دنیا کو سکھایا کہ جسم کو قید کیا جا سکتا ہے، ایمان کو نہیں۔

امام علی رضا علیہ السلام کو ولی عہدی کی پیشکش کے ذریعے سیاسی طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن آپ نے اپنے کردار سے اس سازش کو ناکام بنایا اور بالآخر شہید کر دیے گئے۔

امام محمد تقی علیہ السلام، امام علی نقی علیہ السلام اور امام حسن عسکری علیہ السلام کی زندگیاں بھی مسلسل نگرانی، محدود آزادی، حکومتی دباؤ اور بالآخر شہادت سے عبارت ہیں۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر امام حسن عسکری علیہ السلام تک شیعہ عقیدے کے مطابق ایک مسلسل سلسلۂ شہادت دکھائی دیتا ہے۔ اس تسلسل نے شیعہ ذہن کو یہ سبق دیا کہ حق کا راستہ ہمیشہ قیمت مانگتا ہے، لیکن یہی قیمت تاریخ کو بدل دیتی ہے۔

امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی غیبت کو بھی شیعہ عقیدے میں اسی تاریخی سلسلے کے تناظر میں سمجھا جاتا ہے۔ شیعہ روایت کے مطابق اگر آپ بھی ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں شہید کر دیے جاتے تو اللہ کا وہ وعدہ، جس کے مطابق زمین عدل و انصاف سے بھرے گی، اپنے مقررہ وقت پر پورا نہ ہوتا۔ اس لیے غیبت کو بھی حق کے تحفظ اور الٰہی منصوبے کے تسلسل کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔

یہاں ایک بنیادی حقیقت قابلِ غور ہے۔ دنیا میں شہادت کی مثالیں دوسری اقوام اور مذاہب میں بھی موجود ہیں، لیکن تشیع کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے شہادت کو صرف ایک حادثہ یا سانحہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے ایک مستقل تہذیب، ایک زندہ ثقافت اور ایک تربیتی نظام میں تبدیل کر دیا۔

اسی لیے شیعہ معاشرے میں عاشورا صرف ایک یادگار دن نہیں بلکہ ایک مسلسل درسگاہ ہے۔ مجالس، مراثی، نوحے، زیارات، عزاداری، اربعین اور شہداء کی یاد محض جذباتی اظہار کے ذرائع نہیں بلکہ اجتماعی حافظے، اخلاقی تربیت، ظلم کے خلاف شعور اور حق سے وابستگی کو زندہ رکھنے کے وسائل ہیں۔ ان رسومات کی اصل روح یہی ہے کہ ہر نسل یہ سوال اپنے آپ سے پوچھے کہ اگر وہ کربلا میں ہوتی تو کس صف میں کھڑی ہوتی۔

اسی ثقافت نے تشیع کے اندر ایک منفرد نفسیاتی کیفیت پیدا کی ہے۔ جو قوم اپنے بچوں کو بچپن سے یہ سکھائے کہ عزت کے ساتھ مرنا، ذلت کے ساتھ جینے سے بہتر ہے، اسے صرف فوجی طاقت یا سیاسی دباؤ سے مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ اسی لیے تاریخ میں بارہا ایسا ہوا کہ جب بھی تشیع کو مٹانے کی کوشش کی گئی تو ہر شہید کے بعد پہلے سے زیادہ مضبوط نسل سامنے آئی۔

یہی شہادت کی ثقافت تشیع کی سب سے بڑی حفاظتی دیوار بھی ہے اور اس کی سب سے بڑی جاذبیت بھی۔ بہت سے غیر شیعہ اور غیر مسلم مفکرین بھی جب کربلا کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں اس میں ایک ایسی اخلاقی عظمت دکھائی دیتی ہے جو مذہبی حدود سے بلند ہو کر پوری انسانیت سے خطاب کرتی ہے۔ اگرچہ ان کے نتائج اور عقائد مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن امام حسین علیہ السلام کی

استقامت، اصول پسندی اور قربانی کو دنیا بھر میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

تاہم تشیع کی قوت صرف خون بہانے یا شہادت کے جذبے میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر قربانی دینے والی تحریک ہمیشہ زندہ رہتی، جبکہ تاریخ اس کی تائید نہیں کرتی۔ تشیع میں شہادت کے ساتھ علم، اخلاق، عبادت، عدل، تنظیم اور مسلسل تربیت بھی موجود ہے۔ یہی جامعیت اس کی اصل طاقت ہے۔

پانچواں باب: مظلومیت سے دعوت تک: تشیع نفرت کا نہیں، محبت، خدمت اور امید کا مکتب کیوں بن گیا؟

تاریخ کا ایک عجیب اصول ہے کہ مسلسل ظلم کا شکار ہونے والی بہت سی قومیں اور تحریکیں رفتہ رفتہ نفسیاتی طور پر تلخ، انتقام پسند اور نفرت پر مبنی شناخت اختیار کر لیتی ہیں۔ ان کی گفتگو کا مرکز مستقبل کی تعمیر نہیں بلکہ ماضی کے زخم بن جاتے ہیں۔ ان کی پوری شناخت اپنے مخالفین سے نفرت کے گرد گھومنے لگتی ہے۔ لیکن تشیع کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایک حیرت انگیز حقیقت سامنے آتی ہے۔ صدیوں تک ظلم، قتل، قید، جلاوطنی، پروپیگنڈے اور سیاسی محرومیوں کا سامنا کرنے کے باوجود تشیع اپنی بنیادی روح میں نفرت کا مذہب نہیں بنا، بلکہ محبت، خدمت، روحانیت، علم اور امید کا مکتب بن کر سامنے آیا۔ یہ اس کی ایک ایسی خصوصیت ہے جسے سمجھے بغیر اس کی عالمی جاذبیت کو سمجھنا ممکن نہیں۔

اس کی پہلی وجہ یہ ہے کہ تشیع کی بنیاد صرف مظلومیت پر نہیں بلکہ معرفت پر ہے۔ مظلومیت اس کی تاریخ کا ایک حصہ ہے، لیکن اس کی پوری شناخت نہیں۔ اگر تشیع صرف مظلومیت کا نام ہوتا تو اس کی تمام مذہبی سرگرمیاں

صرف ماتم، گریہ اور احتجاج تک محدود ہوتیں، جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ شیعہ معاشروں میں عبادت، دعا، قرآن، تعلیم، خیرات، خدمتِ خلق، علمی تحقیق، اخلاقی تربیت، خاندانی نظام اور سماجی تعاون بھی اسی شدت سے موجود ہیں جس شدت سے عزاداری موجود ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تشیع نے اپنے زخموں کو اپنی شناخت نہیں بنایا بلکہ انہیں اپنی اصلاح اور بیداری کا ذریعہ بنایا۔

کربلا کی یاد بھی اسی لیے زندہ رکھی جاتی ہے کہ انسان ظلم کو پہچان سکے، نہ کہ ہر مخالف انسان سے نفرت کرنا سیکھے۔ امام حسین علیہ السلام نے یزید کی مخالفت کی تھی، انسانیت کی نہیں۔ آپ نے ظلم کا انکار کیا تھا، انسان سے نفرت کی دعوت نہیں دی تھی۔ یہاں تک کہ میدانِ کربلا میں بھی دشمن کے پیاسے لشکر کو پانی پلایا گیا، حر بن یزید ریاحی کی توبہ قبول کی گئی، اور آخری لمحے تک نصیحت کا دروازہ بند نہیں کیا گیا۔

یہ طرزِ عمل ایک بہت بڑا پیغام دیتا ہے کہ تشیع شخص کے بجائے ظلم کا مخالف ہے، اور انسان کے بجائے اس کے باطل عمل کا ناقد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اصلاح کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔

دوسری بڑی وجہ اہل بیت علیہم السلام کی اخلاقی تعلیمات ہیں۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام نے مالک اشتر کے نام اپنے مشہور فرمان میں لکھا کہ رعایا دو قسم کی ہے؛ یا وہ دین میں تمہارا بھائی ہے یا خلقت میں تمہارا ہم جنس۔ یہ ایک ایسا اصول ہے جس نے شیعہ فکر کو صرف اپنے ماننے والوں تک محدود نہیں رہنے دیا بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ عدل، احترام اور خیر خواہی کا رشتہ قائم کیا۔

اسی طرح امام حسن علیہ السلام کی بردباری، امام زین العابدین علیہ السلام کی دعائیں، امام محمد باقر علیہ السلام اور امام جعفر صادق علیہ السلام کی علمی نشستیں، امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا حلم اور دیگر ائمہ کی سیرت اس بات کی گواہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام نے اپنے ماننے والوں کو صرف اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا نہیں سکھایا بلکہ دوسروں کے حقوق کی حفاظت بھی سکھائی۔

یہی وجہ ہے کہ تشیع کی اصل دعوت تلوار سے زیادہ کردار کے ذریعے ہوئی ہے۔

تاریخ میں ایسے بے شمار علاقے ہیں جہاں لوگ کسی فوج کے ذریعے نہیں بلکہ اہل بیتؑ سے محبت رکھنے والے تاجروں، علماء، مبلغین اور صالح افراد کے حسنِ کردار سے متاثر ہوئے۔ جب لوگ یہ دیکھتے تھے کہ یہ لوگ عبادت میں بھی ممتاز ہیں، تجارت میں بھی دیانت دار ہیں، معاشرت میں بھی خوش اخلاق

ہیں اور ظلم کے سامنے بھی ثابت قدم ہیں تو وہ اس کردار کے پس منظر کو جاننے کی کوشش کرتے تھے۔

درحقیقت کردار ہر زمانے کی سب سے مؤثر دعوت ہے۔

تشیع کی عالمی جاذبیت کا ایک اہم سبب اس کی خدمتِ خلق کی روایت بھی ہے۔

شیعہ معاشروں میں وقف، خیرات، سادات و مستحقین کی مدد، مدارس، یتیموں کی کفالت، طبی خدمات، مساجد، امام بارگاہیں، زائرین کی خدمت، اربعین کے مواقع پر لاکھوں افراد کی مفت میزبانی اور مختلف رفاہی سرگرمیاں صرف سماجی کام نہیں بلکہ عبادت سمجھی جاتی ہیں۔

خصوصاً اربعین کا منظر دنیا کے بہت سے لوگوں کے لیے حیرت کا باعث بنتا ہے۔ لاکھوں لوگ مختلف قوموں، زبانوں، رنگوں اور معاشرتی طبقات سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کی خدمت کرتے ہیں۔ کوئی کھانا پیش کر رہا ہے، کوئی پانی پلا رہا ہے، کوئی جوتے صاف کر رہا ہے، کوئی راستہ دکھا رہا ہے اور کوئی بیماروں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ دنیا کی مادی تہذیب، جہاں ہر خدمت کی قیمت طے ہوتی ہے، وہاں یہ بے لوث خدمت بہت سے لوگوں کو سوچنے پر

مجبور کرتی ہے کہ آخر کون سی طاقت ہے جو انسان کو اس طرح ایثار پر آمادہ کرتی ہے؟

شیعہ نقطۂ نظر میں اس کا جواب محبتِ اہل بیت علیہم السلام ہے۔

یہاں ایک اور اہم پہلو بھی ہے۔

تشیع صرف ماضی کی یاد میں زندہ نہیں رہتا بلکہ مستقبل کی امید پر بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر کسی تحریک کے پاس صرف مظلومیت کی داستان ہو اور مستقبل کا کوئی روشن تصور نہ ہو تو آہستہ آہستہ اس کے پیروکار مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن تشیع میں امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا عقیدہ ہر دور میں امید، حرکت اور اصلاح کا سرچشمہ بنتا ہے۔

یہ امید صرف یہ نہیں کہ ایک دن ایک عظیم رہنما آئے گا، بلکہ یہ بھی کہ اس دن کے لیے خود کو تیار کرنا ہر مومن کی ذمہ داری ہے۔ اس لیے حقیقی انتظار سستی، بے عملی یا دنیا سے فرار کا نام نہیں بلکہ خود سازی، معاشرہ سازی، علم، اخلاق، عدل اور ظلم کے خلاف جدوجہد کا نام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ شیعہ فکر میں "منتظر" کا تصور ایک فعال انسان کا تصور ہے، نہ کہ ایک غیر متحرک انسان کا۔

اسی امید نے تشیع کو ہر دور میں نئی توانائی دی ہے۔ جب ایک قوم یہ یقین رکھتی ہو کہ ظلم دائمی نہیں، عدل کا غلبہ یقینی ہے اور اللہ کا وعدہ سچا ہے، تو وہ وقتی ناکامیوں سے مایوس نہیں ہوتی۔

اسی پس منظر میں تشیع کی ایک اور نمایاں خصوصیت سامنے آتی ہے، اور وہ ہے خود احتسابی۔

اہل بیت علیہم السلام نے اپنے پیروکاروں کو صرف دوسروں پر تنقید کرنا نہیں سکھایا بلکہ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا بھی سکھایا۔ اگر شیعہ ہونے کا دعویٰ ہو لیکن کردار میں جھوٹ، خیانت، ظلم، تکبر، رشوت، بددیانتی اور بے انصافی ہو تو وہ اہل بیتؑ کی حقیقی پیروی نہیں۔ اسی لیے ائمہ علیہم السلام نے بارہا فرمایا کہ ہماری زینت بنو، ہمارے لیے باعثِ عار نہ بنو۔

یہ جملہ دراصل پوری دعوتی حکمت کا خلاصہ ہے۔

لوگ پہلے کردار کو دیکھتے ہیں، پھر عقائد کو سنتے ہیں۔ اگر کردار اہل بیتؑ کی تعلیمات کا آئینہ بن جائے تو بہت سی زبانیں خاموش اور بہت سے دل کھل جاتے ہیں۔

یہاں ایک اہم احتیاط بھی ضروری ہے۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تشیع کی عالمی جاذبیت صرف مخالفین کی کمزوری کی وجہ سے ہے، لیکن یہ تجزیہ مکمل

نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف لوگ مختلف اسباب سے تشیع کا مطالعہ کرتے یا اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ کچھ کو کربلا متاثر کرتی ہے، کچھ کو نہج البلاغہ، کچھ کو صحیفۂ سجادیہ، کچھ کو اہل بیتؑ کا اخلاق، کچھ کو اجتہاد کی علمی روایت اور کچھ کو ظلم کے خلاف اس کا مستقل موقف۔ اس لیے ہر شخص کا سفر مختلف ہو سکتا ہے۔

البتہ ایک بات تقریباً مشترک نظر آتی ہے کہ جب کوئی شخص تعصب سے ہٹ کر اہل بیت علیہم السلام کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے وہاں عبادت اور سیاست، علم اور عمل، عدل اور محبت، روحانیت اور معاشرت، عقل اور عشق، صبر اور جہاد، سب ایک دوسرے سے مربوط نظر آتے ہیں۔ یہی جامعیت تشیع کو محض ایک فقہی مکتب نہیں رہنے دیتی بلکہ ایک مکمل طرزِ حیات کے طور پر پیش کرتی ہے۔

یہی جامعیت اس کی اصل جاذبیت ہے۔

چھٹا باب: تشیع کو مٹانے کی کوششیں کیوں ناکام رہیں؟ اس مکتب کے حفاظتی نظام کیا ہیں؟

اگر دنیا کی تاریخ میں ان تحریکوں کا جائزہ لیا جائے جنہیں ریاستی طاقت نے ختم کرنے کی کوشش کی، تو ان میں سے اکثر چند دہائیوں یا زیادہ سے زیادہ ایک دو صدیوں کے اندر تاریخ کا حصہ بن گئیں۔ بعض کو فوجی طاقت نے ختم کر دیا، بعض کو معاشی دباؤ نے، بعض کو داخلی اختلافات نے اور بعض کو فکری جمود نے۔ لیکن تشیع کی تاریخ اس عمومی اصول سے مختلف نظر آتی ہے۔ اس مکتب کو صرف ایک حکومت نے نہیں بلکہ مختلف ادوار میں مختلف سلطنتوں، مختلف سیاسی نظاموں، مختلف فکری تحریکوں اور مختلف ابلاغی ذرائع نے چیلنج کیا، مگر یہ نہ صرف باقی رہا بلکہ ہر دور میں نئے انداز سے ابھرتا رہا۔

یہ سوال صرف مذہبی نہیں بلکہ تاریخی اور سماجی بھی ہے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ تشیع کی بنیاد کسی ایک سلطنت، ایک قوم یا ایک جغرافیے پر قائم نہیں۔ دنیا کی بہت سی تحریکیں اس وقت کمزور پڑ جاتی ہیں جب ان کی ریاست ختم ہو جاتی ہے، لیکن تشیع نے اپنی تاریخ کا بڑا حصہ بغیر

ریاست کے گزارا ہے۔ اس نے اپنی شناخت کو حکومت سے نہیں بلکہ عقیدے، علم اور معاشرے سے وابستہ رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حکومتیں بدلتی رہیں، تب بھی تشیع کا فکری وجود باقی رہا۔

یہ ایک غیر معمولی خصوصیت ہے۔ اگر کسی نظریے کی بقا صرف اقتدار پر منحصر ہو تو اقتدار ختم ہوتے ہی نظریہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ لیکن اگر نظریہ دلوں، ذہنوں، عبادت گاہوں، گھروں اور تعلیمی مراکز میں زندہ ہو تو اسے ختم کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔

اسی لیے تاریخ میں جب بھی شیعہ حکمرانیاں ختم ہوئیں، شیعہ فکر ختم نہیں ہوئی، کیونکہ اس کا اصل مرکز عوام کے دل تھے، نہ کہ صرف حکومتی ایوان۔ دوسرا حفاظتی نظام "مرجعیتِ علم" ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اہل بیت علیہم السلام نے صرف دین کی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ ایسے شاگرد بھی تیار کیے جو علم کو آگے منتقل کریں۔ پھر یہی سلسلہ محدثین، فقہاء اور علماء تک پہنچا۔ اس طرح ایک ایسا علمی تسلسل قائم ہوا جس نے ہر دور میں نئی نسل کو دین سے جوڑے رکھا۔

یہاں ایک اہم فرق سمجھنا ضروری ہے۔

بہت سی تحریکوں میں رہنما کے انتقال کے بعد خلا پیدا ہو جاتا ہے، لیکن تشیع میں علم کا ادارہ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ ہر دور میں علماء نے صرف کتابیں نہیں لکھیں بلکہ شاگرد تیار کیے، مدارس قائم کیے، مناظرے کیے، سوالات کے جواب دیے اور دین کو نئے حالات میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس مسلسل علمی سلسلے نے تشیع کو فکری موت سے محفوظ رکھا۔

تیسرا حفاظتی نظام "مجلس" ہے۔

بعض لوگ مجلس کو صرف ایک مذہبی اجتماع سمجھتے ہیں، حالانکہ تاریخی اعتبار سے مجلس تشیع کا سب سے طاقتور تعلیمی اور تہذیبی ادارہ رہی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ ایک ایسا معاشرہ جس پر بار بار پابندیاں لگیں، جس کے علماء کو شہید کیا گیا، جس کی کتابیں جلائی گئیں، اس نے اپنی تاریخ، اپنے عقائد، اپنی اخلاقیات اور اپنے اجتماعی شعور کو کس طرح محفوظ رکھا؟

اس کا ایک بڑا جواب مجالس ہیں۔

مجلس صرف مصائب سنانے کا نام نہیں۔ اگر اپنی اصل روح کے ساتھ منعقد ہو تو وہ قرآن کی تفسیر بھی ہے، سیرتِ اہل بیتؑ کی تعلیم بھی، تاریخ کا شعور بھی، اخلاق کی تربیت بھی، سماجی اصلاح بھی، ظلم کے خلاف آگاہی بھی اور آئندہ نسلوں کی فکری تعمیر بھی۔

اسی طرح عزاداری صرف غم کا اظہار نہیں بلکہ اجتماعی حافظے (Collective Memory) کی حفاظت کا ذریعہ بھی ہے۔ دنیا میں بہت سی قومیں اپنی تاریخ بھول گئیں، لیکن تشیع نے اپنی تاریخ کو نسل در نسل زندہ رکھا۔ ایک بچہ جب مجلس میں بیٹھتا ہے تو وہ صرف ایک واقعہ نہیں سنتا بلکہ حق، باطل، عدل، ظلم، وفاداری، ایثار اور قربانی کے مفاہیم بھی سیکھتا ہے۔

چوتھا حفاظتی نظام "خاندان" ہے۔

تشیع کی بہت سی تعلیمات گھر کے ماحول سے منتقل ہوتی ہیں۔ ماں بچوں کو اہل بیت علیہم السلام سے محبت سکھاتی ہے، باپ انہیں نماز، دعا اور اخلاق کی تربیت دیتا ہے، بزرگ اپنی نسلوں کو کربلا کی داستان سناتے ہیں، محرم اور رمضان جیسے مواقع پورے خاندان کو ایک روحانی ماحول میں لے آتے ہیں۔ یوں عقیدہ صرف کتابوں میں نہیں رہتا بلکہ زندگی کا حصہ بن جاتا ہے۔

پانچواں حفاظتی نظام "شعائر" ہیں۔

قرآن مجید شعائرِ الٰہی کی تعظیم کو تقویٰ سے جوڑتا ہے۔ شیعہ فکر میں عاشورا، اربعین، میلاد، شہادتوں کی یاد، زیارات، دعا اور دیگر شعائر صرف رسمیں نہیں بلکہ ایمان کی تجدید کے مواقع ہیں۔

البتہ یہاں ایک بنیادی شرط بھی ہے۔ اگر شعائر اپنی اصل روح، یعنی معرفت، تقویٰ، اصلاحِ نفس اور ظلم سے نفرت کے بجائے صرف رسم و رواج میں تبدیل ہو جائیں تو وہ اپنی اصل تاثیر کھو سکتے ہیں۔ اسی لیے اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں ہمیشہ شعور اور اخلاص پر زور دیا گیا ہے۔

چھٹا حفاظتی نظام "عالمی ہونا" ہے۔

تشیع نے کبھی اپنے آپ کو کسی ایک نسل، زبان یا قوم تک محدود نہیں کیا۔ اگر یہ صرف عربوں کا مذہب ہوتا تو شاید عرب دنیا سے باہر نہ پھیلتا۔ اگر صرف ایرانیوں کا مذہب ہوتا تو دوسرے معاشروں میں جگہ نہ بنا پاتا۔ لیکن آج شیعہ مسلمان عرب، عجم، ترک، کرد، افریقی، یورپی، جنوبی ایشیائی، وسطی ایشیائی اور دنیا کے بے شمار دیگر معاشروں میں موجود ہیں۔

یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کی دعوت نسلی نہیں بلکہ اصولی ہے۔

ساتواں حفاظتی نظام "مسلسل خود اصلاح" ہے۔

تشیع کی تاریخ میں جب بھی کوئی فکری، اخلاقی یا سماجی کمزوری پیدا ہوئی تو علماء، مصلحین اور اہلِ فکر نے اس کی اصلاح کی کوشش کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکتب اپنے اندر تنقیدی جائزے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اگر کوئی معاشرہ اپنی غلطیوں کو دیکھنا چھوڑ دے تو اس کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن جو معاشرہ مسلسل اپنے آپ کا محاسبہ کرتا رہے، اس کے اندر تجدید کی قوت باقی رہتی ہے۔

یہ تمام عوامل اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن ان سب سے بڑھ کر ایک حقیقت ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

شیعہ عقیدے کے مطابق تشیع کی اصل حفاظت اللہ تعالیٰ کی سنت اور اس کے وعدے سے وابستہ ہے۔ قرآن مجید کا اصول ہے کہ اللہ اپنے نور کو مکمل کرے گا اگرچہ باطل کی قوتیں اسے بجھانا چاہیں۔ اسی طرح قرآن یہ بھی اعلان کرتا ہے کہ اللہ کی جماعت ہی بالآخر کامیاب ہو گی، اگرچہ آزمائشیں طویل کیوں نہ ہوں۔

شیعہ نقطۂ نظر میں اہل بیت علیہم السلام اسی نورِ ہدایت کے امین ہیں۔ اسی لیے تشیع اپنے وجود کو محض انسانی منصوبہ نہیں سمجھتا بلکہ اسے الٰہی ہدایت کے تسلسل کا حصہ سمجھتا ہے۔ یہی ایمان اسے ہر دور میں نئی قوت عطا کرتا ہے۔

تاہم یہاں ایک نہایت اہم تنبیہ بھی ضروری ہے۔

یہ تمام حفاظتی نظام اس وقت تک مؤثر رہتے ہیں جب تک ان کی روح زندہ رہے۔ اگر علم تحقیق چھوڑ دے، اگر مجالس اصلاح کے بجائے صرف رسم بن

جائیں، اگر عزاداری کردار سازی کے بجائے محض جذبات تک محدود ہو جائے، اگر مرجعیت علم کے بجائے شخصیت پرستی میں بدل جائے، اگر انتظارِ امام مہدیؑ عمل کے بجائے سستی کا بہانہ بن جائے، اور اگر اہل بیتؑ سے محبت ان کی سیرت کی پیروی کے بغیر صرف دعوے تک محدود رہ جائے، تو پھر یہی طاقتیں کمزوری میں بھی تبدیل ہو سکتی ہیں۔

اس لیے تشیع کی بقا صرف اس کے دشمنوں کی ناکامی کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے اپنے اندر موجود علمی، روحانی اور اخلاقی نظاموں کی مسلسل تجدید سے وابستہ ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے سمجھنے کے بعد اگلا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر تشیع کے پاس اتنی مضبوط فکری اور روحانی بنیادیں موجود ہیں تو پھر اس کی ذمہ داری کیا بنتی ہے؟ کیا اس کا مقصد صرف اپنے وجود کی حفاظت ہے یا پوری انسانیت کے لیے کوئی عالمی پیغام بھی رکھتا ہے؟

ساتواں باب: اکیسویں صدی میں تشیع کی عالمی ذمہ داری: ظہورِ امام مہدیؑ کی تیاری اور انسانیت کی رہنمائی

گزشتہ ابواب میں ہم نے یہ دیکھا کہ تشیع کی قوت کا راز اس کی توحیدی بنیاد، امامت کے نظریے، علمی روایت، شہادت کی ثقافت، اخلاقی نظام اور مضبوط اجتماعی اداروں میں پوشیدہ ہے۔ اب ایک نہایت اہم سوال سامنے آتا ہے۔ اگر یہ سب کچھ درست ہے تو کیا تشیع کا مقصد صرف اپنی شناخت کو محفوظ رکھنا ہے؟ کیا اس کی تمام جدوجہد صرف اپنے ماننے والوں کے دفاع تک محدود ہے؟ یا اس کے پاس پوری انسانیت کے لیے بھی کوئی ایسا پیغام موجود ہے جو عصر حاضر کے بحرانوں کا جواب بن سکتا ہے؟

شیعہ نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب واضح ہے۔ تشیع کسی نسلی، علاقائی یا فرقہ وارانہ منصوبے کا نام نہیں بلکہ ایک عالمگیر الٰہی مشن کا تسلسل ہے۔ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم **رحمۃ للعالمین** بنا کر بھیجے گئے، اسی طرح اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات بھی کسی خاص قوم کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے ہیں۔ اس لیے اگر تشیع اپنے آپ کو صرف ایک فرقے کی حد تک محدود کر لے تو وہ اپنے اصل مقصد سے دور ہو جائے گا۔

یہاں ایک بنیادی غلط فہمی کو بھی دور کرنا ضروری ہے۔ بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا انتظار صرف ایک عقیدہ ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب امام ظہور فرمائیں گے تو وہ خود ہی تمام مسائل حل کر دیں گے، اس لیے موجودہ حالات میں ہماری ذمہ داری صرف انتظار کرنا ہے۔

لیکن اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات اس تصور کی تائید نہیں کرتیں۔

شیعہ روایات میں انتظار کو افضل اعمال میں شمار کیا گیا ہے، لیکن یہ انتظار بے عملی کا نام نہیں۔ اگر کوئی کسان فصل کا انتظار کرتا ہے تو وہ پہلے زمین تیار کرتا ہے، بیج بوتا ہے، پانی دیتا ہے اور پھر فصل کا منتظر ہوتا ہے۔ اگر کوئی طالب علم کامیابی کا انتظار کرتا ہے تو وہ پہلے محنت کرتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک مومن ظہور کا منتظر ہے تو اسے پہلے اپنے آپ کو، اپنے خاندان کو، اپنے معاشرے کو اور اپنی فکر کو اس عظیم عالمی انقلاب کے لیے تیار کرنا ہو گا۔

اس لیے حقیقی انتظار دراصل مسلسل آمادگی کا نام ہے۔

یہ آمادگی سب سے پہلے انسان کے باطن سے شروع ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص زبان سے امام مہدیؑ کی محبت کا دعویٰ کرے لیکن اس کے اندر جھوٹ،

خیانت، ظلم، حسد، تکبر، بد دیانتی اور خود غرضی موجود ہو تو وہ در حقیقت اس معاشرے کی تیاری نہیں کر رہا جسے امام مہدیؑ قائم کریں گے۔

امام مہدیؑ کا انقلاب صرف حکومتوں کی تبدیلی نہیں ہو گا بلکہ انسانوں کی تبدیلی بھی ہو گا۔ اگر انسان تبدیل نہ ہوں تو صرف نظام بدلنے سے بھی مسائل دوبارہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اہل بیت علیہم السلام نے ہمیشہ فرد سازی کو معاشرہ سازی پر مقدم رکھا۔

یہاں تشیع کی ایک عظیم خصوصیت سامنے آتی ہے۔ اس نے ہمیشہ انقلاب کو اخلاق سے جوڑا ہے۔ اگر طاقت اخلاق سے جدا ہو جائے تو وہ ظلم بن جاتی ہے، اور اگر اخلاق طاقت سے جدا ہو جائے تو وہ صرف نصیحت بن کر رہ جاتا ہے۔ اہل بیت علیہم السلام نے ان دونوں کو ایک دوسرے کا تکملہ بنایا۔

اکیسویں صدی میں پوری دنیا کئی بڑے بحرانوں کا شکار ہے۔ مادی ترقی بے مثال ہے، لیکن انسان کے اندر سکون کم ہوتا جا رہا ہے۔ ذرائع ابلاغ میں وسعت آئی ہے، لیکن انسانوں کے درمیان اعتماد کم ہوا ہے۔ معلومات کی فراوانی ہے، لیکن حکمت کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ دولت میں اضافہ ہوا ہے، لیکن عدل میں اضافہ نہیں ہوا۔ ٹیکنالوجی ترقی کر رہی ہے، لیکن خاندان کمزور

ہو رہے ہیں۔ طاقتور ممالک مزید طاقتور ہو رہے ہیں، لیکن کمزور اقوام زیادہ بے بس ہوتی جا رہی ہیں۔

ایسے ماحول میں تشیع صرف ایک تاریخی شناخت کے طور پر نہیں بلکہ ایک فکری متبادل کے طور پر سامنے آ سکتا ہے۔

یہ متبادل کیا ہے؟

یہ متبادل ایک ایسے انسان کا تصور ہے جو خدا کا بندہ ہو، نہ کہ خواہشات کا غلام۔

ایک ایسے معاشرے کا تصور جو عدل پر قائم ہو، نہ کہ استحصال پر۔

ایک ایسی معیشت جو صرف دولت کی گردش نہ دیکھے بلکہ انسان کی عزت کو بھی محفوظ رکھے۔

ایک ایسی سیاست جو اقتدار کے لیے نہیں بلکہ خدمت کے لیے ہو۔

ایک ایسی تعلیم جو صرف روزگار پیدا نہ کرے بلکہ کردار بھی پیدا کرے۔

ایک ایسی تہذیب جو انسان کو مشین نہ بنائے بلکہ انسان ہی رہنے دے۔

یہی وہ اصول ہیں جو امام مہدی علیہ السلام کی عالمی حکومت کے بنیادی خدوخال کے طور پر شیعہ روایات میں بیان کیے گئے ہیں۔

لیکن یہاں ایک نہایت اہم سوال پیدا ہوتا ہے۔

اگر تشیع کے پاس اتنا عظیم پیغام ہے تو کیا صرف اس کا موجود ہونا کافی ہے؟

جواب یقیناً نفی میں ہے۔

پیغام اس وقت مؤثر بنتا ہے جب اس کے ماننے والے خود اس کا نمونہ بن جائیں۔

اگر شیعہ معاشرے میں بے ایمانی، فرقہ واریت، بدعنوانی، تعصب، جہالت، علمی پسماندگی، اخلاقی کمزوری، باہمی اختلافات اور ناانصافی عام ہو تو پھر دنیا اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کو نہیں بلکہ ان تعلیمات کے ناقص نمائندوں کو دیکھے گی۔

اسی لیے ائمہ علیہم السلام نے بار بار فرمایا کہ "لوگوں کو اپنی زبانوں سے نہیں بلکہ اپنے اعمال سے دعوت دو۔"

یہ جملہ اکیسویں صدی میں پہلے سے کہیں زیادہ اہم ہو چکا ہے۔

آج دنیا سوشل میڈیا، مصنوعی ذہانت، ڈیجیٹل ابلاغ اور عالمی رابطوں کا دور دیکھ رہی ہے۔ اب ایک شخص کی گفتگو چند لمحوں میں پوری دنیا تک پہنچ سکتی ہے۔ اسی طرح ایک شخص کا غلط کردار بھی لاکھوں لوگوں کے سامنے آ سکتا ہے۔ اس لیے آج ہر شیعہ صرف اپنے خاندان کا نمائندہ نہیں بلکہ غیر محسوس طریقے سے اہل بیت علیہم السلام کا نمائندہ بھی بن جاتا ہے۔

اس حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ تشیع اپنی تمام تر توانائیاں صرف ردِ عمل میں صرف نہ کرے بلکہ مثبت تعمیر پر بھی صرف کرے۔

اسے ایسے تعلیمی ادارے قائم کرنے چاہئیں جو علم اور ایمان دونوں پیدا کریں۔

ایسے تحقیقی مراکز جو جدید دنیا کے سوالات کا علمی جواب دے سکیں۔

ایسے رفاہی ادارے جو انسانیت کی خدمت کو عبادت سمجھیں۔

ایسے ذرائع ابلاغ جو نفرت کے بجائے حکمت، استدلال اور اخلاق کے ساتھ اہل بیتؑ کی تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔

ایسے خاندان جو اپنے بچوں میں صرف مذہبی معلومات نہیں بلکہ صداقت، امانت، عدل، نظم، محنت، خدمت اور حسنِ اخلاق بھی پیدا کریں۔

اگر یہ سب ہو گا تو تشیع کی دعوت خود بخود دنیا تک پہنچے گی، کیونکہ دنیا آج صرف تقریریں نہیں بلکہ عملی نمونے تلاش کر رہی ہے۔

یہاں ایک اور بنیادی حقیقت بھی سمجھنا ضروری ہے۔

امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا ظہور صرف شیعوں کی کامیابی کے لیے نہیں ہو گا بلکہ پوری انسانیت کے لیے رحمت ہو گا۔ شیعہ روایات کے مطابق آپ کی حکومت میں عدل، امن اور انسانی کرامت پوری زمین پر قائم

ہو گی۔ اس لیے جو شخص واقعی امام مہدیؑ کا منتظر ہے، اسے آج ہی سے ہر اس کام میں شریک ہونا چاہیے جو عدل، علم، اخلاق، خدمت اور انسانی عزت کو فروغ دیتا ہو۔

آخر میں یہ کہنا بجا ہو گا کہ تشیع کی اصل قوت صرف اس کے ماضی میں نہیں بلکہ اس کے مستقبل میں بھی ہے۔ اس کا ماضی قربانیوں سے روشن ہے، اس کا حال علم اور مزاحمت سے زندہ ہے، اور اس کا مستقبل امید سے وابستہ ہے۔ یہی امید اسے مایوسی سے بچاتی ہے، یہی امید اسے حرکت دیتی ہے، اور یہی امید اسے ایک عالمگیر انسانی مشن کا حامل بناتی ہے۔

اسی لیے شیعہ نقطۂ نظر میں ظہورِ امام مہدیؑ کا انتظار تاریخ سے فرار نہیں بلکہ تاریخ کو اس منزل تک پہنچانے کی ذمہ داری قبول کرنے کا نام ہے۔

آٹھواں اور آخری باب:

تشیع: ایک زندہ الٰہی تحریک اور مستقبل کی ذمہ داریاں

اس پورے مضمون میں ہم نے اس بنیادی سوال کا جائزہ لیا کہ آخر وہ کون سا راز ہے جس نے تشیع کو چودہ صدیوں کی مسلسل آزمائشوں، سیاسی مخالفتوں، عسکری حملوں، فکری یلغاروں، فرقہ وارانہ تعصبات اور ابلاغی پروپیگنڈوں کے باوجود نہ صرف زندہ رکھا بلکہ اسے دنیا کے مختلف معاشروں تک پہنچا دیا۔ شیعہ نقطۂ نظر سے اس سوال کا جواب کسی ایک عامل میں نہیں بلکہ ایک مکمل الٰہی نظام میں پوشیدہ ہے۔

اگر صرف مظلومیت کسی نظریے کو زندہ رکھ سکتی تو تاریخ میں بہت سی مظلوم قومیں ہمیشہ زندہ رہتیں، حالانکہ ایسا نہیں ہوا۔

اگر صرف علم کسی مکتب کو باقی رکھ سکتا تو بہت سے عظیم فلسفیانہ مکاتب کبھی ختم نہ ہوتے، لیکن وہ بھی تاریخ کے صفحات میں محدود ہو گئے۔

اگر صرف جذبات کسی تحریک کو زندہ رکھ سکتے تو وقتی انقلابات کبھی ختم نہ ہوتے۔

اور اگر صرف سیاسی طاقت ہی کامیابی کا معیار ہوتی تو انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوتیں اپنے ابتدائی ادوار ہی میں ختم ہو جاتیں۔

تشیع کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے ان تمام عناصر کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا۔ اس نے توحید کو ولایت سے، ولایت کو عدالت سے، عدالت کو اخلاق سے، اخلاق کو علم سے، علم کو عبادت سے، عبادت کو خدمت سے، خدمت کو شہادت سے، اور شہادت کو امید سے جوڑ دیا۔ یہی جامعیت اس کی اصل قوت ہے۔

تشیع کی پوری تاریخ پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو ایک حقیقت بار بار سامنے آتی ہے کہ اس مکتب نے کبھی اپنے اصولوں کو وقتی مفادات پر قربان نہیں کیا۔ اقتدار ملا تو بھی اصول باقی رہے، اقتدار نہ ملا تو بھی اصول باقی رہے۔ حکومت ملی تو بھی اہل بیت علیہم السلام کا معیار عدل تھا، اور جب حکومت چھین لی گئی تب بھی ان کا معیار عدل ہی رہا۔ یہی استقامت ہر دور میں اس مکتب کی شناخت بنی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس امت کی بنیاد رکھی، اس کا مقصد صرف عبادت گزار افراد پیدا کرنا نہیں تھا بلکہ ایسے انسان پیدا کرنا تھا جو زمین پر اللہ کی امانت کو عدل، علم اور تقویٰ کے ساتھ قائم کریں۔ شیعہ عقیدے کے مطابق اہل بیت علیہم السلام اسی نبوی منصوبے کے امین اور محافظ ہیں۔

اسی لیے تشیع کا اصل مرکز کسی مخصوص جغرافیے، نسل یا زبان میں نہیں بلکہ قرآن اور اہل بیتؑ کی تعلیمات میں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بھی تشیع کو دبانے کی کوشش کی گئی، اس نے اپنی بقا کے لیے نئے راستے پیدا کیے۔ کبھی مدارس کے ذریعے، کبھی علماء کے ذریعے، کبھی عزاداری کے ذریعے، کبھی دعاؤں کے ذریعے، کبھی اجتہاد کے ذریعے، کبھی شہداء کے خون کے ذریعے اور کبھی خدمتِ خلق کے ذریعے۔

اس پورے سفر میں ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ تشیع نے اپنے وجود کو ہمیشہ ذمہ داری سمجھا ہے، برتری نہیں۔ اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات میں کہیں یہ نہیں ملتا کہ صرف نام کا شیعہ ہونا نجات کی ضمانت ہے۔ اس کے برعکس ہر جگہ عمل، تقویٰ، امانت، دیانت، عدل، عبادت اور حسنِ اخلاق پر زور دیا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی شخص اہل بیتؑ سے محبت کا دعویٰ کرے لیکن اس کی تجارت میں خیانت ہو، اس کے گھر میں ظلم ہو، اس کی زبان جھوٹ بولتی ہو، اس کا کردار تکبر سے بھرا ہو، اس کی سیاست دھوکے پر قائم ہو، اس کی معیشت حرام پر کھڑی ہو، اور اس کی معاشرت بے انصافی سے آلودہ ہو تو وہ درحقیقت اہل بیتؑ کے پیغام کی نمائندگی نہیں کر رہا۔

آج تشیع کے سامنے سب سے بڑا خطرہ شاید بیرونی دشمنوں سے زیادہ داخلی کمزوریاں ہیں۔

اگر علم کمزور ہو جائے تو جذبات انتہا پسندی میں بدل سکتے ہیں۔

اگر اخلاق کمزور ہو جائے تو عبادت ریاکاری بن سکتی ہے۔

اگر عدل کمزور ہو جائے تو طاقت ظلم میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

اگر اخلاص کمزور ہو جائے تو خدمت بھی شہرت کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

اگر وحدت کمزور ہو جائے تو اختلاف دشمن کی طاقت بن جاتا ہے۔

اور اگر خود احتسابی ختم ہو جائے تو زوال کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اسی لیے آج ہر شیعہ کو یہ سوال خود سے پوچھنا چاہیے کہ کیا میں صرف اہل بیتؑ کا محب ہوں یا ان کا نمائندہ بھی ہوں؟

کیا میری نماز لوگوں کو خدا کی طرف مائل کرتی ہے؟

کیا میری دیانت میرے عقیدے کی گواہی دیتی ہے؟

کیا میری گفتگو میں حکمت ہے؟

کیا میرے اختلاف میں انصاف ہے؟

کیا میری عزاداری میرے کردار کو بدل رہی ہے؟

کیا میرا انتظارِ امام مہدیؑ مجھے زیادہ ذمہ دار، زیادہ بااخلاق، زیادہ باعلم اور زیادہ مفید انسان بنا رہا ہے؟

اگر ان سوالات کے جواب مثبت ہیں تو یہی حقیقی تشیع ہے۔

اگر جواب نفی میں ہیں تو اصلاح کی ضرورت ہے، کیونکہ اہل بیت علیہم السلام نے اپنے ماننے والوں کو ہمیشہ محاسبۂ نفس کی دعوت دی ہے۔

اسی تناظر میں اکیسویں صدی کا شیعہ صرف ایک عزادار نہیں بلکہ ایک معلم، ایک محقق، ایک مصلح، ایک خادم، ایک دیانت دار تاجر، ایک عادل حکمران، ایک ذمہ دار والد، ایک بااخلاق نوجوان، ایک امانت دار ملازم، ایک انصاف پسند قاضی، ایک دیانت دار صحافی، ایک مخلص استاد اور ایک باکردار شہری بھی ہونا چاہیے۔

جب یہ تمام صفات ایک معاشرے میں جمع ہو جائیں گی تو وہ معاشرہ خود اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کی زندہ تفسیر بن جائے گا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں تشیع اپنی حقیقی عالمی جاذبیت حاصل کرتا ہے۔

لوگ صرف کتابیں پڑھ کر متاثر نہیں ہوتے، بلکہ زندہ کردار دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔

وہ صرف عقائد سن کر نہیں بدلتے بلکہ اخلاق دیکھ کر بدلتے ہیں۔

وہ صرف دلائل سے قائل نہیں ہوتے بلکہ انصاف، محبت، خدمت اور قربانی کا عملی نمونہ دیکھ کر سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ شیعہ نقطۂ نظر میں تشیع کی اصل تبلیغ منبر سے پہلے کردار سے ہوتی ہے، تقریر سے پہلے عمل سے ہوتی ہے، اور دعوے سے پہلے نمونے سے ہوتی ہے۔

آخر میں اس پورے مضمون کا خلاصہ ایک جملے میں کیا جا سکتا ہے:

شیعہ عقیدے کے مطابق تشیع اس لیے زندہ ہے کہ اس کی بنیاد کسی فرد، قوم، سلطنت یا وقتی سیاسی طاقت پر نہیں بلکہ اللہ کی توحید، قرآن کی ہدایت، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت، اہل بیت علیہم السلام کی ولایت، شہداء کی قربانی، علماء کی علمی امانت، صالحین کے اخلاق اور امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کی امید پر قائم ہے۔ جب تک یہ عناصر زندہ رہیں گے، تشیع بھی زندہ، متحرک اور اثر انگیز رہے گا، اور جب بھی ان عناصر میں کمزوری آئے گی، اس کی تجدید اور اصلاح کی ضرورت باقی رہے گی۔

پس تشیع کا مستقبل صرف اس بات پر منحصر نہیں کہ اس کے مخالف کتنے طاقتور ہیں، بلکہ اس بات پر زیادہ منحصر ہے کہ اس کے ماننے والے قرآن، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام کی تعلیمات کے

کتنے سچے آئینہ دار بنتے ہیں۔ اگر وہ علم میں گہرے، اخلاق میں بلند، عبادت میں مخلص، خدمت میں بے لوث، عدل میں ثابت قدم اور تقویٰ میں مضبوط رہیں گے تو شیعہ عقیدے کے مطابق یہ مکتب آئندہ بھی انسانیت کے لیے ہدایت، امید اور بیداری کا سرچشمہ بنا رہے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کو کامل فرمائے اور حضرت بقیۃ اللہ الاعظم امام مہدی عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے ذریعے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے، جس طرح وہ ظلم و جور سے بھر چکی ہو گی۔

اختتام

تشیع کی قوت کا
راز اور اس کی
عالمی جاذبیت